زکوٰۃ کا نفاذ: چند قابل غور پہلو

پروفیسر احمد اقبال قاسمی ○

اسلام انسانی زندگی کو براہِ راست اللہ کی بندگی پر قائم رکھنے کا ضابطۂ کار ہے۔ اسلام عقیدہ و نظامِ عمل، اخلاق و قانون اور سلطان و اقتدار اور تبلیغ کا جامع ہے۔ اسلام خارجی طور پر احکام و ضوابط سے اور داخلی طور پر احساسات ور جحانات اور نفسیاتی کیفیات کی اصلاح اور تربیت کرتا ہے تا کہ معاشرے میں فطری عدل، ہم آہنگی اور توازن پروان چڑھے۔

اسلام میں نماز کے ساتھ جو فریضہ سب سے اہم ہے وہ زکوٰۃ ہے۔ اگر نماز سے شکر گزاری، عبدیت، محبت اور تعلق مع اللہ کا رشتہ استوار ہوتا ہے تو زکوٰۃ سے بندوں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کے حقوق ادا کیے جاتے ہیں۔ دونوں فریضے اجتماعی ہیں اور باہم لازم و ملزوم ہیں، دونوں یکساں اہم ہیں۔ زکوٰۃ کی فرضیت معاشرتی استحکام و اخوت کے فروغ کے لیے ایک ربانی تدبیر ہے۔ یہ ربانی تدبیر بقول سید سلیمان ندویؒ ہر ربانی دین میں ملحوظ رکھی گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذریعے عشر مقرر کیا تھا، کوہ سینا پر جو احکام حضرت موسیٰ کو ملے تھے ان میں عشر کا حکم بھی تھا۔ (مولانا ریاض الحسن ندوی، تاریخ عشر، ص ۸۷، مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور)

حضرت عیسیٰؑ نے بخیل دولت مندوں کو اللہ کے عتاب سے ڈراتے ہوئے صدقات دینے کی اخلاقی تعلیم دی تھی۔ تہذیب نفس اور بخل کی بیماری سے شفا کا واحد علاج عشر و زکوٰۃ کا اہتمام ہے جو آسودہ اور حیوانیت سے مغلوب نفس کو خدا کی فرماں برداری کے قابل بنا دیتا ہے (ڈاکٹر سید اسعد گیلانی، فلسفۂ عشر، ص ۶، مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور)۔ جب انسان اپنے مال کا کچھ حصہ اللہ کی راہ میں نکالتا ہے تو وہ مال کے حرص اور اس کی بندگی سے نکل کر خدا کی بندگی میں داخل ہو جاتا ہے اور آخرت پر اس کا یقین مستحکم ہو جاتا ہے۔

زکوٰۃ کا آغاز اور اس کی تدریجی تکمیل

جس طرح نماز کا آغاز مکہ کے ابتدائی دور سے ہوا اور اس کے نظام کی تکمیل مدینہ میں ہوئی۔ اسی طرح زکوٰۃ اور انفاق کی ترغیب بھی مکی دور سے شروع ہوئی اور اس کا پورا نظام آہستہ آہستہ فتح مکہ کے بعد تکمیل کو پہنچا۔ (سید سلیمان ندوی، سیرۃ النبیؐ، ج ۵، ص ۱۵۹، مطبع معارف، اعظم گڑھ، بھارت)

اسلام کے یہ دونوں اجتماعی فرائض مساوی اہمیت کے حامل ہیں۔ محمد رسول اللہؐ کی شریعت دو لفظوں سے عبارت ہے: خدا کا حق اور بھائیوں کا حق۔ پہلے لفظ کا مظہر اعظم نماز ہے، اور دوسرے کا زکوٰۃ۔ یہ دونوں چیزیں اسلام میں ساتھ ساتھ ہیں۔ دونوں کی انفرادی حیثیت بھی اہم ہے اور اجتماعی بھی۔ نماز جماعت اور مسجد کے بغیر بھی ادا ہو جاتی ہے لیکن اپنی فرضیت کے بعض مقاصد و اغراض سے محروم رہتی ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ و عشر کو بھی بیت المال کے نظم کے بغیر انفرادی طور سے بھی ادا کیا جا سکتا ہے مگر اس کی فرضیت کے بعض اہم مقاصد فوت ہو جاتے ہیں۔ (ایضاً، ص ۱۵۳)

ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے اس بحث کو تفصیل سے اپنے مقالے فقہ الزکوٰۃ میں پیش کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ کی ادائیگی صرف انفرادی حسن سلوک نہیں ہے بلکہ یہ ایک اجتماعی ادارہ ہے جس کا انتظام ریاست کی ذمہ

داری ہے۔ اپنے موقف کی تائید میں وہ عبارۃ النص کے طور پر قرآنی آیت وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا (التوبہ ۹:۶۰) کو پیش فرماتے ہیں۔ عاملین کا زکوٰۃ میں حصہ مقرر ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ زکوٰۃ ایک خودکار اور خودکفیل ادارہ ہے۔ نیز ارشاد ربانی خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً (التوبہ ۹:۱۰۳) ''اے نبی تم ان کے اموال میں سے صدقہ وصول کرو'' سے بھی زکوٰۃ کی وصولی و تقسیم کا سرکاری ذمہ داری ہونا مستفاد ہے۔ (ڈاکٹر یوسف القرضاوی'فقہ الزکوٰۃ' ص ۹۲)

ڈاکٹر القرضاوی نے امام مالک' امام شافعی' ابن تیمیہ' امام شوکانی' ابن حزم اور حنفی فقیہ ابن ہمام کے حوالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ عہد نبوت میں زکوٰۃ کے معاملات سرکاری سطح پر طے پاتے تھے۔ آپ ہر قوم اور ہر قبیلے میں اپنے عمال روانہ فرمایا کرتے تھے تاکہ وہ ان کے دولت مندوں سے زکوٰۃ لے کر ان کے غریبوں میں تقسیم کریں (ایضاً' ص ۱۲۳) اور عامۃ الناس کی حوائج ضروریہ کی کفالت کا اہتمام کریں۔

حضور نبی کریمؐ نے فتح مکہ کے بعد اپنے تمام عمال کو زکوٰۃ وعشر کی تحصیل اور ان کی تقسیم پر بڑی تفصیل سے ہدایات دی ہیں۔ عمال کے علاوہ قبائل کے سرداروں اور با اثر اصحاب کو خصوصیت سے ادائیگی زکوٰۃ کی طرف توجہ دلائی ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنی معروف تصنیف الوثائق السیاسیہ میں آنحضورؐ کے ایسے خطوط کو بڑی جامعیت اور تاریخی تحقیق کے ساتھ جمع کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضورؐ کی اپنے آخری ایام میں' سب سے زیادہ جس فرض کی ادائیگی کی طرف توجہ تھی وہ زکوٰۃ وعشر سے متعلق تھی۔ آپؐ بحرین' عمان اور نجران سے لے کر بنی ہوازن' اہل جرش' دومۃ الجندل' بنی حارثہ بنی کلب اور قبیلہ طئی کے سرداروں کو اپنی وفات کے آخری دنوں تک خطوط کے ذریعے زکوٰۃ اور عشر کی ادائیگی کی تاکید فرماتے رہے۔

اس عہد میں' جب کہ خط وکتابت و مراسلت کا بہت ہی خال خال رواج تھا' آنحضورؐ نے اس وسیلے کو بھرپور طریقے سے استعمال فرمایا۔ الوثائق السیاسیہ میں اس موضوع سے متعلق لکھے جانے والے خطوط کی تعداد ۷۰ تک پہنچتی ہے۔ اس سے یہ حقیقت پوری طرح آشکار ہوتی ہے کہ زکوٰۃ وعشر کی تحصیل و تقسیم اسلامی حکومت کی ایک اہم ذمہ داری اور اجتماعی فریضہ کی ادائیگی ہے۔

علامہ محمد یوسف گورایہ نے اپنے ایک مضمون ''نظام زکوٰۃ'' میں سورۂ توبہ کی آیت ۶۰ میں وفی الرقاب اور فریضۃ من اللّٰہ سے زکوٰۃ کے اجتماعی پہلو کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اس آیت سے ان کا استنباط یہ ہے کہ اسلامی حکومت پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ مال زکوٰۃ میں سے غلاموں کی آزادی پر اتنا صرف کرے کہ غلامی کے پھندے میں پھنسے ہوئے انسان آزاد ہو جائیں۔ زکوٰۃ کا فریضہ من اللہ ہونا جس طرح ہر مسلمان کے لیے فرضِ عین ہے' اسی طرح حکومت پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ معاشی وسیاسی اور ہر قسم کی غلامی کا سدباب کرے۔ (یوسف گورایہ' ''نظام زکوٰۃ اور موجودہ معاشی مسائل کا حل' فکر ونظر' ج ۷' اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ' اسلام آباد)

زکوٰۃ کا سرکاری ادارہ ہونا ارشاد ربانی كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً ۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ۭ (الحشر ۵۹:۷)' کہ دولت محض تمہارے سرمایہ داروں کے مابین لینے دینے میں نہ رہے' نیز وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ؀ (الذّٰریٰت ۵۱:۱۹) ''اور ان کے مال میں حصہ مقرر ہے مانگنے والے اور محروم کا'' سے واضح ہوتا ہے۔ یہ آیات ہمیں زکوٰۃ کے اجتماعی فریضہ اور نظم ونسق کے قیام کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔

اس بحث کو حضرت ابوعبیدہ نے کتاب الاموال میں بہت سے آثار کے حوالوں کے ساتھ پیش کیا ہے کہ مال تجارت کی زکوٰۃ لوگ خود بھی انفرادی طور سے دیتے تھے اور خلفا کو بھی دیتے تھے لیکن زرعی پیداوار اور مویشیوں کی زکوٰۃ کی ادائیگی صرف حکومت کو ہی ادا کرنے سے ادا ہو سکتی ہے۔ انفرادی طور پر زکوٰۃ دینے سے فرض پورا نہ

ہوگا۔ (ابوعبیدہ، کتاب الاموال، ص ۶۸۵، مطبوعہ قاہرہ مع تعلیق محمد خلیل ہراس، ۱۹۷۹)

حضرت شاہ ولی اللہ نے بھی ازالۃ الخفاء میں مسئلے کو اس طرح بیان کیا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو جو وصیتیں کی تھیں ان میں یہ بات بھی شامل تھی کہ جو شخص زکوٰۃ خلیفہ کے مقرر کردہ عامل کے علاوہ کسی اور کو دے گا تو اس کا صدقہ مقبول نہ ہوگا، چاہے ساری دنیا صدقے میں کیوں نہ دے دے۔ (حضرت شاہ ولی اللہ، ازالۃ الخفاء، ج ۳، ص ۳۶۹، مطبوعہ کارخانہ تجارت کتب، کراچی)

اس ساری بحث کا ماحصل یہ ہے کہ زکوٰۃ اجتماعی فریضہ اور سرکاری ذمہ داری ہے اور اسے بیت المال میں جمع کیا جانا چاہیے۔

اسلام کے اقتصادی نظام میں زکوٰۃ کی حیثیت اساسی اور محوری ہے۔ قرآن حکیم کی آٹھ مکی اور ۲۲ مدنی سورتوں میں زکوٰۃ کا بیان ہے۔ ۲۷ مقامات پر نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ساتھ ساتھ ہے۔ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر نے اپنی ایک تصنیف میں توجہ دلائی ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ کے جو احکامات قرآن حکیم میں ہیں وہ ایتائے زکوٰۃ سے متعلق ہیں۔ اسی طرح بخل، تکاثر اور ذخیرہ اندوزی کے لیے جو نواہی ہیں وہ بھی زکوٰۃ کے مقتضیات سے ہیں (ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، فلسفۂ زکوٰۃ، ص ۵۵، فیروز سنز، کراچی، بحوالہ از ڈاکٹر عبدالخالق مصالح زکوٰۃ، مطبوعہ)۔ اس لحاظ سے قرآن حکیم میں ۸۲ مقامات میں زکوٰۃ کا ذکر صراحتاً یا اشارۃً النص کے طور پر ملتا ہے۔

قرآن حکیم کے بعد اگر احادیث کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں حدیث کی تمام اہم کتب میں کتاب الزکوٰۃ کا مستقل حصہ ملے گا۔ اختصاراً چند احادیث پیش کی جاتی ہیں:

۱- سنن ابی داؤد میں حضرت سمرہؓ سے مروی ہے: قال کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یامرنا ان نخرج الصدقۃ مما نُعدُّ للبیع ، حضرت سمرہ بن جندبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں حکم دیا کرتے تھے کہ ہم اس مال سے زکوٰۃ نکالیں جو خرید و فروخت کے لیے متعین کر دیا گیا ہو۔ (بحوالہ از محمد طاسین، اسلام کی عادلانہ اقتصادی تعلیمات، ص ۱۷۹، مجلس علمی فاؤنڈیشن، کراچی)

۲- حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے مروی ہے: لیس فی العروض زکوٰۃ الا ان تکون تجارۃً، استعمال اور صَرف کی چیزوں میں زکوٰۃ نہیں ہے مگر ان میں جو تجارت کے لیے ہوں۔ (سنن البیہقی بحوالہ از مولانا محمد طاسین، اسلام کی عادلانہ اقتصادی تعلیمات، ص ۱۷۹)

۳- طبرانی میں حضرت ابو درداء سے مروی ہے: اَدُّوْا زکٰوۃ اموالکم ، اپنے مالوں کی زکوٰۃ ادا کرو۔ (ایضاً، ص ۱۷۹)

ان قرآنی آیات اور احادیث نبویہ اور آثار و اقوال صحابہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اموال جو خرید و فروخت کے کاروبار سے تعلق رکھتے ہوں ان پر زکوٰۃ واجب ہے۔ فقہائے کرام نے ان سے یہ کلیہ مستنبط کیا ہے کہ زکوٰۃ ہر اس سرمائے پر عائد ہوتی ہے جو نفع کمانے کی غرض سے کسی بھی کاروبار میں زیرِ تصرف ہو۔ گویا ہر طرح کی تجارت کا مال جو بقدر نصاب ہو اور ایک سال کی مدت پوری ہو چکی ہو، اس پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہے، جب کہ وہ مال اس کی ضروری حاجات سے زائد ہو۔

سونا چاندی، نقد و زیورات و دیگر عروضِ تجارت کے مسائل عام طور پر کتب فقہ میں اور ائمہ مساجد سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ اس لیے اختصار کی غرض سے ان کا بیان نہیں کر رہے ہیں البتہ بعض جدید اموال اور صنعتوں کے متعلق گفتگو کی جاتی ہے۔

اموالِ تجارت کی بعض نئی اقسام

سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کی وجہ سے بعض ایسے اموال وجود میں آ گئے ہیں اور ایسی شکلیں پیدا ہو گئی ہیں جو پہلے موجود نہ تھیں۔ ایسے اموال کی زکوٰۃ کے مسائل میں فقہا کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے، مثلاً بڑی بڑی مشینیں جو

مختلف صنعتی کارخانوں میں نصب ہیں، ٹرانسپورٹ میں مستعمل بسیں اور ٹرک، بحری اور ہوائی جہاز جو حمل ونقل میں کام آتے ہیں، زرعی آلات ٹریکٹر وغیرہ۔ جن کی قیمتیں لاکھوں اور کروڑوں بلکہ اربوں روپے کی مالیت کی ہوتی ہیں۔ اسی طرح تجارتی کمپلیکس، ہوٹل وغیرہ۔ آیا یہ اموال زکوٰۃ کے زمرے میں شمار ہوں گے یا یہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہوں گے؟

ہندو پاک کے اکثر مکاتبِ فقہ کے علما بشمول دیوبندی مکتبِ فکر کے مفتیان، مذکورہ مشینوں اور آلات وغیرہ پر زکوٰۃ عائد نہیں کرتے۔ البتہ ان کارخانوں اور صنعتوں سے جو دولت حاصل ہوتی ہے اس پر زکوٰۃ عام تجارت کے اصولوں کے مطابق عائد ہوگی (مولانا محمد رفعت قاسمی، مسائلِ زکوٰۃ، مطبوعہ ادارہ اسلامیات، لاہور)۔ ڈاکٹر سید اسعد گیلانی بھی یہی رائے رکھتے ہیں۔ (سید اسعد گیلانی، ڈاکٹر، اسلام کا نظامِ عشر و زکوٰۃ، ص ۱۸۴، مطبوعہ مکتبہ تعمیر انسانیت، اردو بازار، لاہور)

دیوبندی مکتبِ فکر کے عظیم فقیہ مولانا محمد طاسین رحمۃ اللہ علیہ جو عرصہ تک اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن بھی رہے، انھوں نے اپنی فاضلانہ تصنیف اسلام کی عادلانہ اقتصادی تعلیمات میں اس موضوع پر بڑی مفصل اور مدلل بحث کی ہے۔ ان کے نزدیک تمام جدید صنعتیں، کارخانے، آلات اور مشینیں سب کے سب اموالِ تجارت قرار پاتی ہیں اس لیے کہ ان میں سے ہر ایک کے اندر نفع کمانے کے لیے سرمائے کا تصرف ہے۔ اور یہ تمام اموال عروضِ تجارت کی شرائط پوری کرتے ہیں اور وجوبِ زکوٰۃ کی گرفت میں آتے ہیں۔ اس لیے مارکیٹ کی قیمت کے لحاظ سے ڈھائی فی صد سالانہ ان اموال کی زکوٰۃ دینا ضروری ہے۔ (مولانا محمد طاسین، اسلام کی عادلانہ اقتصادی تعلیمات، ص ۱۸۰)

موصوف رحمۃ اللہ علیہ اپنی رائے میں منفرد نہیں ہیں۔ مصر و شام کے محققین بھی ان کی رائے سے اتفاق رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے اپنی تصنیف فقہ الزکوٰۃ کی ساتویں فصل میں بڑی تفصیل سے اس موضوع پر بحث پیش کی ہے اور اسی موقف کی حمایت کی ہے۔ دوسرے بڑے اسکالروں میں ڈاکٹر ابوزہرہ، پروفیسر عبدالوہاب خلاف اور ڈاکٹر عبدالرحمن حسن جیسے اہلِ علم اسی رائے کے حامی ہیں (ڈاکٹر یوسف القرضاوی، فقہ الزکوٰۃ، ج ۱، ص ۵۹۲، ترجمہ: البدر پبلی کیشنز، لاہور)۔ ڈاکٹر ابوزہرہ کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ اموالِ منقولہ کی زکوٰۃ ڈھائی فی صد تسلیم کرتے ہیں اور اموالِ ثابتہ کی زکوٰۃ پیداوار اور منافع پر عائد کرتے ہیں اور ان سے عشر کے حساب سے زکوٰۃ وصول کرنے کی سفارش کرتے ہیں جیسا کہ وہ لکھتے ہیں: فان تطبیق ھذا المبدأ فی المصانع و الدور یکون باخذ عشر الصافی بعد النفقات ' کارخانوں اور گھروں کے سلسلے میں ابتدا کی تطبیق یہ ہے کہ ان پر اٹھنے والے مصارف کو وضع کرکے باقی صافی اموال پر عشر لیا جائے گا۔

فقہا کا اختلافِ رائے

وجوبِ زکوٰۃ کے دائرے کو وسیع نہ کرنے والے فقہا کا کہنا ہے کہ

۱- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن اموال کی تحدید فرما دی ہے جن پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اور اُن اموال میں حاصل شدہ منافع، زمین، جانور اور مشین کے کرائے شامل نہیں ہیں۔ جب تک اللہ اور رسولؐ کی جانب سے کوئی نصِ صریح موجود نہ ہو، کوئی حکم لازم نہیں کیا جا سکتا۔

۲- کسی بھی زمانے میں فقہا نے ان اشیا پر وجوبِ زکوٰۃ کی بات نہیں کی۔

۳- رہایشی گھروں، پیشہ وروں کے آلات، سواری کے جانور، زیرِ استعمال گھریلو سامان پر زکوٰۃ نہ ہونے کی تصریح کی گئی ہے۔

توسیع کے قائل فقہا کی رائے

صدرِ اول میں ایسے مسائل پیدا ہی نہیں ہوئے اس لیے ہمیں تصریح کے ساتھ ان کے احکام بھی نہیں ملتے۔ البتہ

قرآن وسنت میں ایسی اصولی ہدایات ضرور ملتی ہیں جن کی روشنی میں ہم زیر بحث مسائل کا شرعی حکم دریافت کر سکتے ہیں۔ اسی طریقے کو اجتہاد فی المسائل کا نام دیا جاتا ہے اور اس کا دروازہ ہمیشہ کے لیے کھلا رکھا گیا ہے۔ یہ حضرات اپنی آرا کے حق میں درج ذیل دلائل پیش کرتے ہیں:

۱- اللہ سبحانہ نے ہر ایک مال پر ایک مقرر حق، حق معلوم یا زکوٰۃ یا صدقہ لازم فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ○ (المعارج ۷۰:۲۴) ''جن کے مالوں میں ایک مقرر حق ہے''۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً (التوبہ ۹:۱۰۳) ''اے نبیؐ ان کے اموال میں سے صدقہ لے لیجیے''۔
ابن العربی کہتے ہیں کہ یہ فرمان الٰہی ایک حکم عام ہے جو مال کی تمام انواع اور اقسام پر مشتمل ہے خواہ اس مال کا نام کچھ بھی ہو اور اس کا مقصد کوئی بھی ہو۔ جو شخص اس حکم میں تخصیص کا خواہاں ہے اس پر دلیل لازم ہے۔ (فقہ الزکوٰۃ، شرح الترمذی، ج ۳، ص ۱۰۴)
۲- تجارت بمعنی بیع و شرا کے متعلق وجوب زکوٰۃ کا واضح حکم مذکور ہے۔
ارشاد ربانی ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ص (البقرہ ۲:۲۶۷) ''اے صاحبان ایمان ان پاکیزہ اموال میں سے خرچ کرو جو تم نے تجارت میں کمائے اور غلہ جات اور ثمرات میں سے جو ہم نے تمھارے لیے زمین سے نکالے''۔
جمہور مفسرین حضرات نے جن میں امام طبری، امام ابوبکر الجصاص، امام ابوبکر ابن العربی اور امام فخر الدین الرازی شامل ہیں، اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ اس کے اندر مسلمانوں کے لیے وجوبی حکم ہے کہ وہ تجارت کے ذریعے کمائے ہوئے مال اور پیداوار زمین سے زکوٰۃ ادا کریں۔
اس سلسلے میں سنن ابی داؤد کے حوالے سے حضرت سمرہ بن جندبؓ اور طبرانی میں مذکور حضرت ابو دردأؓ سے مروی روایات پیش کی جا چکی ہیں۔ جہاں تک آثار صحابہؓ کا تعلق ہے امام ابوعبیدہ کی کتاب الاموال میں سند صحیح کے ساتھ ان میں سے متعدد کا ذکر ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ سے مروی دو آثار میں پوری صراحت کے ساتھ بیان ہے کہ آپ اپنے عہد خلافت میں مال تجارت پر زکوٰۃ لیتے تھے۔ (محمد طاسین، عادلانہ اقتصادی تعلیمات، ص ۱۸۰)
خلاصہ یہ ہے کہ قرآن حکیم، احادیث نبویہ اور آثار و اقوال صحابہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اموال جو خرید و فروخت کے کاروبار سے متعلق ہوں ان پر زکوٰۃ واجب ہے۔

بیع اور تجارت کا فرق

بالعموم بیع اور تجارت کو بعینہٖ ایک چیز سمجھا جاتا ہے، جب کہ ان دونوں میں فرق ہے جس کے نہ سمجھنے کی وجہ سے اشکالات پیدا ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے ان دونوں میں عموم اور خصوص کا فرق ہے۔ ہر بیع تجارت ہے مگر تجارت کی بعض صورتیں بیع میں داخل نہیں ہیں۔ یہ بات اشارتاً قرآن سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:
رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ (النور ۲۴:۳۷) ''ان میں ایسے لوگ صبح و شام اس کی تسبیح کرتے ہیں جنھیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد اور اقامت نماز و ادائے زکوٰۃ سے غافل نہیں کر دیتی''۔ تجارت کا معطوف علیہ ہونا اور بیع کا معطوف ہونا مغایرت پر دلالت کرتا ہے۔ غرض یہ کہ تجارت کا دائرہ بہت وسیع ہے جو زیر بحث بہت سی شکلوں پر صادق آتا ہے۔

قیاس سے استنباط

قیاس پر عمل کرنے والے فقہا وجوب زکوٰۃ کی علت نمو یعنی افزایش کو قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر علامہ وہبہ الزحیلی اپنی عظیم تصنیف الفقہ الاسلامی وادلتہ میں زیر بحث جدید طریق تجارت و اموال پر عروض تجارت کی

طرح بلحاظ قیمت زکوٰۃ عائد کرنے کے حامی ہیں۔ وہ اپنی رائے اس طرح ظاہر فرماتے ہیں:

میری رائے یہ ہے کہ مذکورہ اموال پر زکوٰۃ واجب ہے۔ کیونکہ وجوب زکوٰۃ کی علت بھی ان اموال میں پائی جاتی ہے' یعنی نمو اور مشروعیت زکوٰۃ کی جو حکمت ہے وہ بھی ان میں پائی جاتی ہے اور وہ حکمت ہے مال داروں کے نفوس کا تزکیہ اور معاشرے کے محتاج لوگوں کی مواسات و ہمدردی مالی امداد کے ذریعے' اور اس فقر و افلاس کے خاتمے میں حصہ لینا جو دنیا کے مختلف نظاموں پر چھایا ہوا ہے۔

الحاصل یہ ہے کہ اہم شرعی ماخذ سے اس مکتبہ فکر کے اصحاب کا موقف بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ موازنے کے لیے قدیم فکر کی اساس مختصراً پیش ہے۔

ان حضرات کے پاس قرآن وسنت کی کوئی صریح دلیل نہیں ہے۔ اس کا سارا انحصار فقہا کی درج ذیل عبارت پر ہے جو حاجات اصلیہ پر زکوٰۃ نہ ہونے سے متعلق ہے:

زکوٰۃ واجب نہیں رہائشی گھروں پر' گھریلو سامان و فرنیچر پر' پیشے کے آلات و اوزار پر' سواری کے جانوروں پر کیونکہ یہ سب حاجات اصلیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ ہلاکت سے بچاتی ہیں۔ امر واقعہ کے طور پر' جیسے کھانے پینے کا غذائی سامان' رہائشی گھر' جنگی اسلحہ' لباس کپڑے جو گرمی اور سردی سے بچاتے ہیں۔ دوسری صورت تقدیری طور پر ہونے کی ہے' جیسے قرض کا مال جس کا ادا کرنا مقروض شخص پر واجب ہوتا ہے ورنہ اس کو قید و بند کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے جو بربادی کی صورت ہے۔ اسی طرح پیشے کے اوزار' گھریلو سامان سواری کے جانور اور اہل علم کی کتابیں جو بے علمی سے بچاتی ہیں۔ جہالت بھی بربادی کی ایک صورت ہوتی ہے۔ (محمد طاسین' اقتصادی تعلیمات ' ص ۱۸۴)

اس عبارت پر غور فرمائیے۔ خود رہائشی مکان ضروری حاجات میں سے ہے۔ اس پر زکوٰۃ نہیں ہوتی مگر اس پر کرائے پر اٹھائے جانے والے بڑے بڑے عمارتی کمپلیکس کو کیونکر قیاس کیا جاسکتا ہے۔

اسی طرح ہنرمند لوگوں کے آلات و اوزار جن کو استعمال کرکے وہ خود روزی کماتے ہیں زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہیں۔ اس لیے کہ وہ آلات ان کے لیے حاجات اصلیہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر ان آلات پر کارخانوں کی مشینوں کو جن کو ملازمین انجینیر وغیرہ چلاتے ہیں کیونکر قیاس کیا جاسکتا ہے۔ یہ واضح طور پر قیاس مع الفارق ہے۔

نئے اموال پر وجوب زکوٰۃ سے متعلق بحث کو جناب ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے بڑی جامعیت کے ساتھ اپنی تحقیقی مقالے کی ساتویں فصل میں پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں دمشق میں ۱۹۵۲ء میں منعقدہ زکوٰۃ کانفرنس کے نتائج بحث کو بھی تفصیل سے بیان فرماتے ہیں۔ (حلقه الدراسات الاجتماعیه' للجامعة العربیه' ص ۲۴۱ تا ۲۴۸ بحوالہ فقه الزکوٰۃ ۵۹۸-۶۵۰)

اسلام کے نظام کفالت عامہ اور مقاصد شرع کو ملحوظ رکھتے ہوئے احقر بھی حضرت مولانا محمد طاسین مرحوم اور ڈاکٹر یوسف القرضاوی اور ڈاکٹر ابو زہرہ' پروفیسر عبدالوہاب خلاف کے نظریات کی پوری طرح تائید کرتا ہے اور اس یقین کا اظہار کرتا ہے کہ جب تک ہم اللہ اور رسولؐ کے عطا کردہ احکامات پر ان کی سچی روح اور جذبے سے عمل نہیں کریں گے' ہم نہ استحکام حاصل کرسکیں گے' نہ اپنی آزادی ہی باقی رکھ سکیں گے۔ مسلم حکومتوں کے عروج و زوال پر بہت سے محققین نے قلم اٹھایا ہے اور تجزیے پیش کیے ہیں مگر ایک بڑی حقیقت یہی ہے کہ انھوں نے انھی احکامات سے انحراف کیا' بیت المال کو اپنی خواہشات کے مطابق خرچ کیا' عوام پر ایسے ٹیکس لگائے جو ظلم پر مبنی تھے۔ محبت' اخوت' مساوات اور ہمدردی کے بجائے عصبیتوں اور نفرتوں کو پروان چڑھایا۔ بنی امیہ' بنی عباس' آل عثمان اور مغل حکمران' سب کے زوال کے جو اسباب تھے آج بھی ہم انھی معائب میں گرفتار ہیں۔

اگر ہم نے حقیقی معنوں میں زکوٰۃ‘ صدقات اور عدل اجتماعی کا نظام قائم نہ کیا تو ہم بھی زوال اور بربادیوں سے محفوظ نہیں رہ سکتے!